گویائی کے سفر کا لسانیاتی تناظر

A Linguistic Perspective of Speech

i ڈاکٹر ثمرینہ لیاقت ii ڈاکٹر نادیہ iii ڈاکٹر یاسمین سلطانہ

Abstract:

Thousands of years ago there were many concepts of starting language. People used to think that the language is a god's gift for human by considering that a human being born with his native language or mother language but later on this concept was proven wrong and concluded, through, different experiments that human learn language with his learning skills. All the misconceptions and old theories were rejected. Ding Dong theory, bawo wao theory and yu hi so theory was created before harder. There are two main groups that believe of upon two different theories about the origin of words. One thinks that words are produced accidentally and the other believes that words have their meaning in their structure. Language has equal importance in every field of life. Actually, language is the way to convey emotions and feelings through expressions but word have their own importance in the field of linguistics. Words have own meaning their invention. Yask, Panini, Grim, Herder and William Johns worked a lot for language. Khan Arzoo and Sir Syed Ahmed Khan worked a lot for Urdu language.

Keywords: *Language, Experiments, Old concepts, New Ideas, Emotions, Urdu language.*

ہزاروں سال پہلے ابتدائی زبان کے بہت سے تصورات تھے۔ لوگ اپنی مادری زبان یا مادری زبان کے ساتھ پیدا ہونے والی زبان کو انسان کے لیے خدا کا تحفہ سمجھتے تھے لیکن بعد میں یہ تصور غلط ثابت ہوا اور مختلف تجربات کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ انسان اپنی سیکھنے کی مہارت سے زبان سیکھتا ہے۔ . تمام غلط فہمیوں اور پرانے نظریات کو رد کر دیا گیا۔ ڈنگ ڈونگ تھیوری ، باو واو تھیوری اور یو ہیو تھیوری مشکل سے پہلے بنائی گئی۔ دو اہم گروہ ہیں جو الفاظ کی ابتدا کے بارے میں دو مختلف نظریات پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ الفاظ حادثاتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے کا خیال ہے کہ الفاظ کی ساخت میں ان کے معنی ہوتے ہیں۔ زبان کو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ دراصل زبان جذبات و احساسات کو اظہار کے ذریعے پہنچانے کا ذریعہ ہے لیکن لسانیات کے میدان میں لفظ کی اپنی اہمیت ہے۔ الفاظ کے اپنے معنی ہیں ان کی ایجاد۔ یاسک ، پانینی ، گرم ، ہرڈر اور ولیم جانز نے زبان کے لیے بہت کام کیا۔ خان آرزو اور سرسید احمد خان نے اردو زبان کے لیے بہت کام کیا۔

کلیدی الفاظ: اردولسانیات ، اردو زبان ، تجربات ، نطق ، گویائی ، قدیم نظریات ، جدید نظریات

زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اپنے احساس اور خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔[1] انسان اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان کے ساتھ اشاروں سے بھی کام لیتا ہے کبھی دور اور کبھی قریب کا اشارہ ہاتھوں سے کرنا، جیسے آنکھوں سے اٹھنے اور بیٹھنے کا اشارہ کرنا، جہاں تک اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی بات ہے تو یہ عضوی اشاروں کے علاوہ بھی دوسرے ذرائع ہیں جن سے انسان اپنا مقصد اپنی بات دوسروں تک بھیجتا ہے مثلاً روڈ پر زیبرا کراسنگ نظر آتی ہے، دائیں بائیں مڑنے کے نشانات

i معاہداتی استاد ، شعبہ اردو ، وفاقی اردو یونیورسٹی ، عبدالحق کیمپس ، کراچی۔ (Corresponding Author)
ii اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے آرٹس سائنس اور ٹیکنالوجی ، عبدالحق کیمپس ، کراچی۔
iii ایسوسی ایٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے آرٹس سائنس اور ٹیکنالوجی ، عبدالحق کیمپس ، کراچی۔

نظر آتے ہیں، گاڑیوں کو روکنے کے لیے لال بتی اور چلنے کے لیے ہری بتی کی علامتیں نظر آتی ہیں اور بھی ذرائع ہیں جو آوازوں کے بغیر ہی اپنی بات یا مقصد دوسروں بآسانی واضح کر رہی ہوتے ہیں جیسے امن کا پیغام دینے کے لیے سفید جھنڈے کا لہرانا، اس طرح مصوری سے بھی اپنے خیالات کی ترسیل ممکن ہے۔ ہماری زبانوں کے عام الفاظ صرف ایک حد تک ہی آوازوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں اس لیے ماہرِ لسانیات کے مطابق بول چال کی زبان ہی حقیقی معنوں میں زبان ہے۔[۲] خود انسان کے چہرے کی عکاسیت اس کے دِل میں اٹھنے والے خوشی اور غم کے طوفان کا پتا دے رہی ہوتی ہے، الغرض انسان نے کتنے ہی ذرائع اشاروں، علامتوں اور کیفیات کی صورت میں ایجاد کر لیے لیکن خیالات کی ترسیل میں جو اہلیت انسان کی بولنے والی آواز کو حاصل ہے وہ علامتوں اور کیفیات کو حاصل نہیں الغرض زبان لسانیات کی اصطلاح میں وہ آوازیں ہیں جن کے ذریعے انسان اپنے مقصد کو ظاہر کرتا ہے۔ ان آوازوں کو قلم بند کر دیتے ہیں تو ایسی لکھائی کو بھی زبان کا ہی نام دیا جاتا ہے زبان کی پہچان، زبان کا عرفان ہے۔[۳] علم و عرفان اس وقت حاصل ہو جاتا ہے جب زبان کے بارے میں یہ جاننے کے ساتھ کہ وہ کیا ہے اس امر کی معرفت بھی حاصل ہو جائے کہ وہ کیوں ہے؟ انسان نے بولنا سیکھا، انسان کو احساس ہوا کہ ان آوازوں میں وہ معنی بھی ہے جو اس کے جذبات اور خیالات دوسروں تک پہنچا سکے اس لیے لسانیات کی رو سے جب زبان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب آواز میں وہ عیاں و مخفی معانی چھپے ہوں جو دوسرا شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ پہلے لوگ زبان کو سیکھنے کے عمل سے دور گردانتے تھے ان تمام پرانے اور دقیانوسی نظریات پر جان ہرڈر نے ایسے ضرب لگائی۔ ہرڈر کہتا ہے کہ اگر زبان خدا کی دَین ہوتی تو زبان میں غلطیوں کا گمان نہ ہوتا۔ زبان خدا کی عطا کردہ صلاحیت سے سیکھی جاتی ہے نطق کہا جاتا ہے۔[۴] وہ انسان جو پہلے جانوروں ہی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا ان کی آوازیں نکالتا تھا لیکن اب اس نے آوازوں کو معانی بھی دینے شروع کیے اس طرح سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ زبان نے سائنس، علمی، ادبی اور معاشرتی ارتقاء کا عمل بھی جاری رکھا۔ یہ زبان ہی ہے جس نے تہذیب غرض تمام انسانی مسائل کے حل میں بڑھ چڑھ کے حصّہ لیا۔ دورِ جدید میں فرانس کے ماہرینِ لسانیات نے آغازِ زبان کے نہ حل ہونے والے مسئلے کو آکر نظر انداز کر دیا۔ وہاں لسانیات کے مطالعے کا اہم ادارہ فرنچ اکیڈمی قائم ہوا تو ان لوگوں نے ایک اصول خاص طور پر یہ کہ زبان کے سفر کا آغاز کب ہوا اس کا جواب بنایا کہ زبان کی تخلیق پر

غور نہیں کیا، جانئے گا کیوں کہ آج تک کسی بھی ماہرِ لسانیات سے یہ سوال حل نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوشش ہی نہیں کی، بہت سے ماہرینِ لسانیات کے ان سوالوں کے جوابات کے لیے کوشش کی۔ پہلے نظریہ یہ آیا کہ جس طرح خدا نے انسانوں کو پیدا کیا اسی طرح اسے بولنے کے لیے نطق کی قوت بخشی، اس قوت کی مدد سے انسانوں نے بولنا سیکھا اس نظریے کے اثر سے ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کی برتری کے لیے ابتدائی زبان اپنی مذہبی زبان کو بنانا شروع کر دیا۔

ہندوستان میں ویدک جین اور بدھ مذہب میں انکی مذہبی زبانیں جیسے عیسائیوں کی ہبریو کو شرف بخشا گیا، اسی طرح پالی اور ماگدھی کو ہی اولین زبان ہونے کا شرف حاصل ہوا اور یہ تمام ماہرین مذہب کی رو سے اس قدر جذباتی تھے کہ کوئی بھی انکی اپنی زبان کے علاوہ دوسری اور زبانوں کو اوّلیت دینے پر کبھی راضی نہ ہوتا۔ پالی کا مشہور قواعد نویس کچائن کا خیال بھی یہی ہے کہ انسان کی ابتدائی زبان ماگدھی ہی اصل ہو گی۔[۵]

انتہا تو تب ہوئی جب یہ تصوّر ہی قائم ہو گیا کہ جس طرح انسان سانس لیتا ہے خود بخود الفاظ بھی بولنے لگتا ہے گویا وہ پیدائشی بولتا ہے اور اسے کسی بھی اکتساب کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس راز کا پتہ لگانے کے لیے صدیوں پہلے مصر کے ایک بادشاہ نے دو بچوں کو پیدا ہوتے ہی الگ بند کر دیا پرورش اس طرح کی کہ کچھ سالوں تک بچوں کو صرف ایک ملازم انھیں کھانا دے کر آجاتا تھا۔ جب ان بچوں کو کچھ سال معاشرے سے دور رکھا اور ویکوس بول کر روٹی دی جاتی تھی۔ پھر سالوں بعد باہر نکالے گئے اور دیکھا گیا کہ انھوں نے کس قدر بولنا سیکھا ہے تو وہ صرف ویکوس، یعنی روٹی، جو انھوں نے ملازم سے سن لیا ہو گا، بولتے ہوئے پائے گئے۔ بچوں کو کوئی بات کرنا نہیں آتی تھی۔ اس واقعے نے اس مسئلے کو مکمل طور پر حل کر دیا کہ بچے پیدائشی طور پر زبان لے کر نہیں آتا بلکہ وہ سماجی زندگی کے زیرِ اثر زبان سیکھتا ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی نکلا کہ مختلف چیزوں کے نام ان سے نکلنے والی آوازوں کی وجہ سے پڑے۔ جیسے جھر جھر سے جھرنا، کو کو سے کوئل، دروازے کی کھٹ کھٹ سے کھٹکھٹانا۔ اس نظریے کو میکس میولر نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ زبان کی ابتدا کے بارے میں ڈنگ ڈونگ تھیوری بھی دی گئی۔ زبان کی ابتدا کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب انسان کے احساس اسے اندرونی طور پر متاثر کرتے ہیں تو اس کے منہ سے خود بخود کچھ

آوازیں نکلتی ہیں۔ انسان نے ابتدا میں بولنے کے لیے انھی آوازوں سے کام لیا ہو گا۔ پھر مفکرین کا بھی خیال ہے کہ انسان نے جانوروں کی بولیوں سے لفظ لیے۔[۶] کچھ ماہرین نے یہ بھی نظریہ نکالا کہ ہو سکتا ہے کہ زبان کا آغاز ان آوازوں سے ہوا جو اس کے منہ سے محنت کرتے وقت نکلتی ہیں لفظوں کے آغاز کے سلسلے میں افلاطون نے بھی سوالات اٹھائے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ الفاظ اور ان کے مفاہیم یعنی لفظ اور ان سے منسوب چیزوں میں جو تعلق ہے اس کا پتا لگائے کہ آیا یہ فطری ہے یا محض رسمی ہے۔[۷] گویا یہ الفاظ جو زبان میں ہم استعمال کرتے ہیں ان کا چیزوں یا کاموں سے تعلق ہے جن کے لیے ہم وہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں افلاطون نے یہ سوال کر کے بحث کے لیے نئے دروازے ماہرینِ لسانیات کے لیے کھول دیے۔ یہیں سے زبان کی ابتدا میں دلچسپ چکر محسوس ہوتے ہیں، کاٹ یا کٹ کو ہی لے لیں جو اردو میں کاٹ اور انگریزی میں کٹ ہے۔ کسی بھی درخت یا چیز کو کاٹنے کے لیے کلھاڑے کو پیچھے کر کے زوردار طریقے سے آگے کیا جاتا ہے اس طرح کہ درخت کی لکڑی کٹ جاتی ہے۔ اب آپ اس لفظ کو بولتے ہوئے اپنے جبڑے پر غور فرمائیں یہ کلھاڑے کی طرح نیچے جا کر اک دم اوپر آئے گا تو کٹ کی آواز کا لفظ نکلے گا گویا جب کوئی درخت یا چیز کٹتے وقت انسان نے جو حرکت ہوتے ہوئے دیکھی وہ اپنے منہ میں دہرائی تو یہ لفظ ایجاد ہوا اس طرح ایک اور لفظ کوائٹ جس کا مطلب چپ یا ساکن بھی ہوتا ہے اگر اس لفظ کو بولنے کے لیے زبان کو حرکت دی جائے تو کوائٹ بولتے وقت زبان تالو سے اس طرح چپکے گی کہ ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو گا یعنی منہ کی حالت بھی ساکن ہو جائے گی۔ پھر دوسرا لفظ بولنے کے لیے آپ کو زبان تالو سے ہٹانا ہو گی اس طرح ایک اور لفظ درخت لے لیں جو اردو کا لفظ ہے اس سے بولنے لیے پہلے زبان تنے کی طرح اکڑے گی اور پھر لہرانے کی شکل بنائے گی تو درخت کا لفظ زبان سے نکلے گا۔ ایک اور انگریزی لفظ جام لے لیں جس کا مطلب ٹھہرا ہوا ہوتا ہے جما ہوا یا رکا ہوا ہوتا ہے، یہ لفظ جب ہم منہ سے ادا کریں گے تو منہ کی کیفیت بھی یہ لفظ بولنے میں ساکن ہو گی زبان پیچھے ہو گی اور ہونٹ بند گویا رک گیا ہو۔

زبان کی اقسام:

زبان کی مختلف انداز سے مختلف قسمیں رکھی گئی ہیں جیسے اگر دیکھا جائے تو:

ا) زمانے کے لحاظ سے متروک مردہ زبانیں اور قدیم و جدید زبانیں (ملتعق، پیوندی)

۲) ساخت کے لحاظ سے یک سطیائی غیر، اجنبی، بین الاقوامی، مادری، ملکی، بین الصوبائی اور دیہی۔
۳) مقام کے لحاظ سے شہری، کلاسیکی زبان اور ادبی زبان۔
۴) درجات کیفیت کے لحاظ سے بولی زبان، تحریری، علامتی، تقریری، صدائی زبانیں اور حرکاتی۔
۵) معنی کی وسعت کے لحاظ سے اشارتی زبانیں۔[۸]

الغرض ماہرینِ علمِ زبان نے زبان کی مختلف لحاظ سے اقسام بتائی ہیں، جدید ماہرِ لسانیات کا کہنا ہے کہ ابتدائمیں زبان خوف اور جذبات کی آوازوں پر مشتمل تھی مطلب ذہن میں رکھ کر ان کو مختلف لہجوں سے ادا کیا جاتا تھا۔ یہ ابتدائی زبانیں چند سو الفاظ تک ہی محدود تھیں۔ یعنی چیزوں کے نام کے ساتھ ہی مختلف حرکات سے اظہار کیا جاتا تھا کہ سامنے والا انسان بات کا مطلب سمجھ لے۔ ان زبانوں کو لوگ بحث اور گفتگو کے لیے استعمال کرنے کے بجائے مختلف اشیاء کے نام لے کر اپنی بات ضروری حرکات سے سمجھایا کرتے تھے پھر رفتہ رفتہ قبائل بڑھے اور زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک مفکّر کے نزدیک بھی دنیا کی تمام زبانوں کو کسی ایک قدیم ترین مشترکہ زبان کی شاخ ثابت کرنا بہت دشوار ہے کیوں کہ ”زبانوں میں جہاں مادے اور طرز اظہار میں باہم اشتراک نظر آتا ہے وہاں بہت زیادہ زبانوں میں ربط اور اظہار کے طریقے اور اصول و قواعد ترکیب کے لحاظ سے اختلاف بھی نظر آتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ زبانوں نے علیحدہ علیحدہ ماحول میں پرورش پائی ہے۔“[۹]

یہ بات کسی بھی حد تک درست بھی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو تمام زبانوں کا منبع ایک ہی زبان سے جڑا ہوا نظر آتا ہے دنیا کی تمام مختلف نسلوں کے لوگ جو زبان استعمال کر رہے ہوتے ہیں ان میں ایک ہی فطرتِ انسان موجود ہوتی ہے وہ ایک ہی انسانی کیفیت سے گزر رہے ہوتے ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام انسانی زبانوں کی شروعات ایک ہی زبان نے کی ہو؟ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والوں کی تعداد بڑھی وہ پھیلی اور حیران کن زبانیں ایجاد ہوئیں۔ کیوں کہ بشر نے کائنات میں پہلی مرتبہ سرف ایک ہی جگہ پر قدم رکھا اور خدا نے ہی حضرت آدمؑ کو جو کہ پہلے بشر ہیں چیزوں کے نام سکھائے۔ اب وہ پہلی زبان کون سی تھی اس پر تحقیق ابھی باقی ہے لیکن اگر لفظوں کی بناوٹ کی بات کی جائے تو لفظ اپنا مفہوم ہی اپنی ساخت میں رکھتا ہے جیسے کہ ہونٹ بند ہونے کا انداز ہی لفظِ جام کا مطلب بتا رہا ہوتا ہے لفظ پھول ہی لے

لیجیے جیسے بولتے وقت ہوا باہر کی طرف نکلے گی اور منہ کی بناوٹ گول ہو گی جو خوشبو کی طرف ہی اشارہ ہے، دانتوں اور زبان کی حالت میں پھول کی بناوٹ کا بھی اشارہ دے رہی ہو گی الغرض کہ زبان تک میں بنتی ہوئی نظر آئے گی۔ دانت، منہ زیادہ تر الفاظ کی بناوٹ میں اپنے جبڑے ہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لفظ کی ایجاد کے سلسلے میں دو گروہ انا ملسٹ اور انالوگسٹ بہت مشہور ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ لفظ کی بناوٹ فطری ہے جبکہ دوسرے نے اسے غیر فطری قرار دیا ہے۔ ایک کے مطابق لفظ اور اس کی بنیاد باضابطگی اور منطق پر ہے یعنی الفاظ بے سروپا نہیں بنائے گئے بلکہ ان کے وجود میں منطق کا وجود پایا جاتا ہے۔ جیسے اردو کا لفظ ہے جس کے دو اجزاء ہیں پن اور 'پن ککڑی' کے پیچھے ان کا مفہوم بھی موجود ہے ککڑی پرندے کی ایک قسم ہے جو پانی میں رہتی ہے یعنی کوئی بھی نام اُس چیز سے جڑا ہوتا ہے جس سے وہ چیز نکلی ہوتی ہے جبکہ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ لفظ بے ضابطگی میں بنائے گئے ہیں لفظ کا مفہوم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے بعد زبانوں کی تحقیقات پر مزید زور دیا گیا اور زبان پر تحقیق کرنے کے عمل کو باقاعدہ نام دیا گیا جسے علمِ زبان کہا جاتا ہے۔ 'علمِ زبان' کی رو سے زبان کے استعمال کے دو حصے ہیں 'نفسیاتی' اور 'میکانکی'۔ نفسیاتی حصے میں وہ تمام تصوّرات آجاتے ہیں جو سامع یعنی سننے والے تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ میکانکی جز کے مزید تین حصے ہوتے ہیں۔

۱۔ منہ سے آواز کا نکلنا۔

۲۔ آواز کا ہوا کی لہروں پر گزر۔

۳۔ سامع کے کان کا آواز پکڑنا۔

انسان جو کچھ سنتا ہے اس کو ہو بہو بیان کرنے کا نام زبان ہے مگر کمال کی بات یہ ہے کہ کسی شخص کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اس کے جذبات و خیالات کا اظہار ہو بہو نہیں کرتے بلکہ انھیں نامکمل اور معمولی حالت میں پیش کرتے ہیں۔ کسی لفظ یا فقرے کو سمجھ لینے کے یہ معانی نہیں ہوتے ہیں کہ وہ لفظ یا فقرہ جس چیز کی ترجمانی کرتا ہو اس کی ہو بہو شکل نظروں کے سامنے آ گئی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سننے والا گونگوں رجحانات سے باخبر ہو گیا یا اس کی نیت میں ایک طرح کی بیداری کا احساس پیدا ہو گیا جو ان اشیاء کی یاد دلاتی ہے جس کی فقرے یا لفظ نے ترجمانی کی ہے۔[۱۰] الغرض الفاظ اس کیفیت کے پوری طرح سے ترجمان

نہیں ہوتے ہیں جس کے لیے وہ ادا کیے جاتے ہیں کسی مفکّر نے تو یہاں تک کہ دیا ہے کہ انسان نے زبان کو اپنی کیفیات کو چھپانے کے لیے ایجاد کی ہے ورنہ اس کے زندہ رہنے کے لیے تو اشارے اور حرکات و سکنات ہی کافی تھے۔

کوئی شخص اگر خوش نظر آ رہا ہے تو وہ یہ بتا رہا ہے کہ خوش ہے مگر کتنا خوش بہت ہی زیادہ خوش کہنے کے بعد تو لفظ کی انتہا ختم ہے۔ غرض کہ کیفیات اور جذبات کی ترجمانی اور عکاسی الفاظ کسی حد تک ہی کر سکتے ہیں انسان کی کیفیات اور اشارے پھر بھی لفظوں سے بازی لے جاتے ہیں مثلاً اگر کوئی اداس ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ میں خوش ہوں چوں کہ اس شخص کی کیفیت بتا رہی ہے کہ وہ اداس ہے اس لیے اس کے کہے گئے لفظوں پہ کہ وہ خوش ہے یقین کوئی نہیں کرے گا ماسوائے اس کاغذ کے کہ جس پر وہ یہ الفاظ لکھ چھوڑے۔ اسی طرح کیفیات کے ساتھ ساتھ اشارے بھی لفظوں پر بازی لے جاتے ہیں مثلاً جب ہم کہتے ہیں 'ادھر آؤ' تو جملہ ادا کرنے سے پہلے ہم اپنا سر ہلاتے ہیں گویا لفظ سے پہلے اشارے کا عمل ہو گزرا، 'ہاں' کہتے ہوئے کبھی کبھی سر اثبات میں ہلاتے ہیں اور کبھی کبھی کام کرنے کا ارادہ نہ ہو تو سر دائیں بائیں ہلاتے ہیں۔ یہ تمام اعمال یہ بتاتے ہیں کہ ترسیل میں الفاظ سے زیادہ اشارے اور کیفیات بازی لے جاتے ہیں۔ زبان کا سفر انسان کے کائنات پر قدم رکھتے ہی شروع ہوا، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے مشکل آسانی کی طرف ارتقا کیا، اور جب یہ مکمل ہو جاتی ہے تو مشکل سے آسانی تک کا سفر طے کرتی ہے جس کا منہ بولتا ثبوت وہ کوڈ ورڈس ہوتے ہیں جو زبان کے وسیع مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مختصراً ادا کیے جاتے ہیں جیسے لفظ میڈ لے ہے جو عموماً جہاز جب کسی خطرے میں ہو تو بولا جاتا ہے اس طرح اور بھی کئی زبانوں میں ایسے الفاظ ہیں جو طویل جملوں سے اجتناب کرنے اور محض ایک لفظ میں سارا مطلب ادا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

زبان پر بہترین گرفت میں زبان کے قواعد اور قوانین خاص اہمیت کے حامل ہیں علمِ زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے تو سب سے پہلی قواعد کی کتاب 'یاسک کی نرکتی' ہے جس کا زمانہ پانچ سو سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔[۱۱] اس کی دیکھا دیکھی میں 'اشٹ ادھیائے' کتاب 'پانی' نے لکھی اس کے بعد تین سو سال قبلِ مسیح اٹھارویں صدی میں 'مہابھاسیہ' پاتنجلی کتاب کی شرح تفسیر لکھی۔ ۱۷۲ میں جائیں تو ایک مفکر

'جان پرڈر' نے لسانیت کی ترقی کے لیے پہلا رستہ کھولا اور بتایا کہ زبان خدا کی زبان ہوتی تو یہ منطقی اور مکمل ہوتی، غیر تبدیل شدہ اور غیر متغیر ہوتی۔ رائج شدہ زبانوں کی بے ترتیبی یہ بتاتی ہے کہ یہ خدا کی تخلیق نہیں ہے بلکہ انسانوں کی تخلیق کردہ ہے پھر اٹھارویں صدی میں تحقیق شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ اس قدر اہمیت کی حامل ہو گئی کہ آج علمِ لسانیت دنیا کے تمام مضامین میں اہم مقام رکھتی ہے بلکہ اس کی کئی شاخیں اور بھی بنا دی گئی ہیں گویا زبان کے علم کو ایسی گویائی عطا ہوئی تمام عالم اس گویائی سے گونج اٹھا۔ بڑے بڑے مفکرین نے علمِ زبان پر دسترست حاصل کی، سر ولیم جونسن نے زبان کے علم کو ایک سائنس قرار دیا، وندرائی، یسپرسن، یاسک، بوپ، شیلگل کے علاوہ ولیم جانسن کے علاوہ ان تمام علمِ زبان کے ماہرین نے اس علم کی تحقیق میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ غرض زبان کی تشکیل کی تبدیلی ان الفاظ پر ہے جو تبدیل ہوتے رہتے ہیں انسانی خیالات پر منحصر ہوتی ہے۔ لفظ بننے کے بعد جب جملوں نے سمجھنے یا سمجھانے کا عمل طے کیا تو لفظوں میں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو لسانی ورثہ چھوڑتی ہے ضروری نہیں وہ نسل اس ورثے کو جوں کا توں اپنائے بلکہ یہ قوی امکان ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ میں خاص تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یہ تبدیلیاں جغرافیائی ماحول کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں اور عفوی عادات وغیرہ کی وجہ سے دیکھی گئی ہیں اطوار کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر قبضہ کرتی ہے تو مقبوضہ زبان بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ہجرت کی وجہ سے بھی زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ عربی کی وجہ سے فارسی زبان متاثر ہوئی جیسے فرانس کی وجہ سے انگریزی منظرِ عام پر آ گئی مسلمانوں سے ابھیری زبان متاثر ہوئی تو اردو منظرِ عام پر آ گئی۔ غرض فارسی، عربی، ترکی یہ تمام زبانیں دوسری زبانوں سے متاثرہ زبانیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے زبان ترقی کرتی جاتی ہے لفظ بھی ترقّی کرتے جاتے ہیں، ان میں تغیّر و تبدّل کا عمل جاری و ساری رہتا ہے یہی غلطی میری نظر میں زبان کی ترقّی کو درست سمت عطا کرتی ہے۔ ماضی میں ولی کے دور میں تیرے کو تجھ کہا جاتا تھا کسی کو کسو کہا جاتا تھا بادشاہ اورنگزیب کے دور میں سے لفظ کو ستے کہا جاتا تھا۔ میرؔ کے دور میں ذرا کو ٹک کہا جاتا تھا۔ ایسے بہت سے الفاظ جن کو عوام نے اپنی آسانی کی وجہ سے بدلا، زندہ اور جاوید ہو گئے۔ ان تبدیلیوں نے زبان کی ترقّی میں اہم کردار ادا کیا اگر سنسکرت کی طرح اردو پر بھی پابندی لگا دی جاتی تو کبھی اتنی ترقّی نہ کرتی۔ زبان ایک ایسی بہتی ندّی کی طرح ہے جو اپنا

راستہ خود بناتی ہے۔ وہ لوگ جو لفظوں کا تلفّظ بوجہِ آسانی بدل رہے ہوتے ہیں اگر دیکھا جائے تو وہ تمسخر کے نہیں بلکہ تحسین کے لائق ہیں۔ زبان کا تغیر اور تبدّل ہی اس کے ترقی کرنے اور زندہ رہنے کی وجہ ہیں۔

لفظوں کی تشکیل میں انسان کے ارادوں کا کتنا عمل دخل ہے آیا کہ لفظوں کی تشکیل ایک خودساختہ عمل سے ہوئی ہے یا، منطق اور ارادے سے اس بات پر بہت سے مفکّرین نے فکر کے دروازے کھول لیے ہیں لیکن اکثر لفظوں میں کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں جو اپنے وجود کے ساتھ اپنی ملتی جلتی چیز کے ساتھ جڑے نظر آتے ہیں۔ ایک لفظ بانسلی جو بانس سے بنتی ہے اور اس سے ایک قسم کا ساز یا لے نکلتی ہے اس ساز کو بانسلی کہتے ہیں جو آگے چل کر 'بانسری' بن گیا۔ ایک شخص جو کسی شخص کے ساتھ مہمان بن کر آتا ہے اسے طفیلی کہتے ہیں، جو کہ طفیل سے طفیلی بن گیا مچھلی سے مچھیرا، چین سے چینی، پاکستان سے پاکستانی غرض یہ کہ اس طرح سے الفاظ بنتے چلے گئے۔ الفاظ کی تشکیل بھلے ہی ارادے یا بغیر ارادے کے، منطق کے ساتھ یا بغیرِ منطق کے ساتھ کی گئی ہو لیکن لفظوں کا مفہوم حیران کن طور پر کبھی ایک ہی خیال کے لیے وقف نہیں ہوتا۔ اکثر ایک لفظ کئی کئی جگہ مختلف معانوں میں استعمال ہو رہا ہوتا ہے اور یہ زبان سمجھنے والوں کے لیے کوئی نیا تجربہ یا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انسان ایک جہاں جو سمجھنا چاہ رہا ہوتا ہے سمجھ لیتا ہے اور مطلوبہ معنی سمجھ لیتا ہے وہ کبھی غلط معنی نہیں لے گا[۱۲] لیکن یہ بات چونکا دینے والی اور حیران کن ہے کہ سا معین کسی بھی لفظ کا معنی ماحول کے مطابق ہی سمجھ لیں گے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ 'کتنا بہترین قطعہ لکھا ہے'۔ 'میں تم سے قطع تعلق کرتا ہوں' ان دونوں جملوں میں قطع الگ الگ معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ انتر یہ ہے کہ یہ سمجھانے والا بھی ناآشنا نہیں ہے اور سمجھانے والا بھی ناآشنا نہیں ہے۔ سمجھانے والا بات بڑی آسانی سے سمجھ لیتا ہے گویا مفہوم کی صورت میں الفاظ بڑی آسانی سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ ماہرینِ لسانیات میں 'شلائی خر' کا نام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے یہ وہ لسان دان تھا کہ جس نے بتایا کہ اعضائے جسم کے مختلف حرکات کا نتیجہ خود زبان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس ماہرِ لسانیات نے نہ صرف کئی زبانوں کا مطالعہ کیا ہوا تھا بلکہ اس نے تقسیم زبان کے اصول بھی نکالے۔[۱۳]

ہندوستان میں پہلی بار علمِ لسانیات پر توجہ ولیم جانسن کے دور سے شروع ہوئی۔ اس میدانِ لسانیات میں بڑے کارہائے نمایاں سر انجام دیے گئے۔ "گرم" ایک ماہرِ علمِ لسانیات تھا یونان اور قدیم

جرمنی زبانوں پر تحقیق شروع کی اور بعد ازاں پتہ لگایا کہ یونانی زبان کے الفاظ سنسکرت تک پہنچتے پہنچتے کس طرح تبدل کا شکار ہوئے اور دوسری زبانیں بھی کس طرح بدولتِ سماجیات و نفسیات تبدیل ہوتی رہی ہیں آہستہ آہستہ یہ علم علمِ صوتیات سے کافی آگے بڑھا اور فلسفہ، نفسیات، سماجیات، طب الغرض ہر میدان میں اہمیت اختیار کر گیا۔ آگے چل کر اس علم کو باقاعدہ سائنس کا مرتبہ دیا گیا۔ رفتہ رفتہ زبانوں کی ترقی نے مختلف مکتب ہائے فکر کو دعوتِ تحقیق کے زیور سے آراستہ کیا۔ اردو میں "آرزو خان" پہلے عالمِ زبان کے مرتبے پر فائز ہوئے، اردو زبان میں بھی علمِ زبان پر بہت کام ہوا۔ انھوں نے سنسکرت اور فارسی میں تعلق کی سب سے پہلے نشان دہی کر دی تھی لیکن تفصیل سے کام نہیں کیا گیا اس لیے اس تعلق کو ۱۷۸۶ء میں جب ولیم جانسن نے برصغیر میں بیان کیا تو بات مشہور ہو گئی اور خان آرزو کا سہرا ولیم جانسن کے سر گیا۔

انشاء اللہ خان انشاء نے دریائے لطافت میں اردو قواعد بیان کیے لیکن اہم مواد مہیا نہیں کر سکے لیکن پھر بھی کئی مسائل سے پردہ اٹھایا۔ چونکہ ان دونوں شاعروں نے فارسی میں زبان پر قلم اٹھایا اس لیے نظروں میں نہ آسکے، اردو میں اردو قواعد کی کتاب سب سے پہلے سر سید احمد خان نے لکھی۔ اس کے علاوہ میدانِ لسانیت میں عبدالقادر سروری، محی الدین ادری، چند جین نے بھی تحقیق کر کے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ محمد حسن رضوی اور شوکت سبزواری کا نام بھی شہرتِ دوام پر ہے۔ یہ علم دنیا میں اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ صرف جرمانیہ میں ہی لسانیات کے موضوع پر بہت سی کتابوں کے علاوہ سیکڑوں رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔[۱۴]

حوالہ جات:

۱۔ عبدالقادر سروری، زبان اور علمِ زبان (حیدرآباد دکن: انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۵۶ء)، ۱۱۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، اردو لسانیات (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، س۔ن)، ۵۔

۴۔ ڈاکٹر سید محمود حسن رضوی، لسانیات اور اردو (کراچی: احباب پبلشرز، س۔ن)، ۵۴۔

۵۔ ایضاً، ۵۵۔

۶۔ ایضاً، ۵۳۔

۷۔ عبدالقادر سروری، زبان اور علمِ زبان، ۲۷۔

۸۔ پروفیسر صفدر علی، اردو لسانیات، ۱۷۵۔

۹۔ ایضاً، ۱۷۶۔

۱۰۔ سید محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، س۔ن)، ۲۹۔

۱۱۔ ڈاکٹر سید محمود حسن رضوی، لسانیات اور اردو، ۳۴۔

۱۲۔ سید محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، ۳۱۔

۱۳۔ ایضاً، ۶۸۔

۱۴۔ ایضاً۔